Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ثقافتی استعماریت: متبادل بیانیہ

(اردو افسانہ کے تناظر میں: چند ابتدائی افسانہ نگار)

*ڈاکٹر خالد محمود
**نثار احمد

ABSTRACT
Culture plays pivotal role in any society without the presence of strong culture society can not nourish. The customs and traditions of any society are it's enlivening force. In the times of Colonialism and even in Post Colonial era the culture of Sub Continent suffered immensely. This research article is an endeavor to bring forth the counter narrative efforts to highlight the local culture in Urdu short story.
Key words: Culture, Custom, Tradition, Colonialism, Counter Narrative

کلیدی الفاظ: ثقافت، رسومات، روایات، نو آبادیات، متبادل بیانیہ

ثقافت کسی بھی سماج میں سانس ڈوری کی حیثیت رکھتی ہے، سماج کا جسم اس کی گردش کے بنا عضو معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ ثقافت ایک متحرک اور متنوع مظہر ہے، اسے کسی بند بوتل یا گملے میں پروان نہیں چڑھایا جا سکتا۔ اس کی افزائش و پرداخت آزاد فضاؤں کی متقاضی ہوتی ہے اور اس کی پرورش کے لوازمات افراد اور ان کے متعین کردہ رسوم رواج فراہم کرتے ہیں۔ جب بوجوہ تاریخی و فکری تنزلی کے ان کی جڑیں کمزور پڑتی ہیں، ان کی طنابیں ٹوٹتی ہیں تو دور دراز کے سماج اپنی بالا دستی کا غلغلہ مچاتے ہوئے ان پر آ ٹوٹتے ہیں۔ زور آور استعمار اپنے مخصوص بیانیے کا قبول اور نفاذ چاہتا ہے۔ ثقافتی اور لسانی بقا کی اس کٹھن اور مقابلہ کن صورت حال میں ہدف زدہ مقامی ثقافت کا متبادل بیانیہ متنوع سانچوں میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔ کسی بھی زبان کا ادب متبادل بیانیے کی ترسیل کا سب سے موثر وسیلہ ثابت ہوتا ہے۔ پیش نظر مضمون میں اردو افسانے کی صنف میں اردو زبان پر ثقافتی یلغار اور اس کے مقابل مزاحمتی متبادل بیانیے کی پیش کاری اور برتاؤ کا جائزہ لیا جائے گا۔

ثقافت، استعمار اور ثقافتی استعماریت:

ثقافت کسی بھی سماج اور قوم کا اہم ترین وظیفہ ہے۔ ثقافت انہیں فکری اور نظریاتی اساس سے سرفراز کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ثقافت ہی وہ مسیحا ہے جو انسانیت میں ایک نئی روح اور ولولہ پھونک دینے کا ضامن ہے۔ ''اردو لغت تاریخی اصول پر'' کے مطابق ثقافت سے مراد کسی قوم یا گروہ انسانی کی تہذیب کے وہ اعلیٰ مظاہر ہیں جو اس کے مذہب، نظام اخلاق علم و ادب، اور فنون میں نظر آتے ہیں۔(۱) اردو زبان کا لفظ ''تہذیب'' انگریزی زبان کے لفظ Culture کے متبادل کے طور پر مدتوں سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ کلچر کے ضمن میں ''تہذیب'' اور ''ثقافت'' کے الفاظ استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ عربی زبان میں تہذیب کے لغوی معنی درخت کو تراشنے، کاٹنے اور اس کی اصلاح کرنے کے ہیں۔ فارسی زبان میں اس کے معنی ہیں، آراستن و پیراستن، پاک و درست و اصلاح نمودن۔(۲) تہذیب کا لفظ اپنے مجازی معنوں میں خوش اخلاقی، اور کردار کی شائستگی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔(۳) انسان جس طرح اپنی معاشرت اور اخلاق کا اظہار کرتا ہے وہ اس کی تہذیب ہے۔(۴) عربی میں ثقافت کے معنی علوم و فنون و ادبیات پر قدرت و مہارت، کسی چیز کو تیزی سے سمجھ لینا، اور اس میں مہارت حاصل کرنا، سیدھا کرنا، گویا یہ لفظ ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے جن کا تعلق ہمارے ذہن سے ہے۔(۵) انتظار حسین ''تہذیب'' کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> جب ایک گروہ کا تصور حیات و کائنات، اس کے عقائد و اوہام، اس کے تصورات و افکار اس کی زندگی کے عمل میں گھل مل کر جلوہ دکھاتے ہیں تو اس جلوے کو ہم اس گروہ کی تہذیب کہنے لگتے ہیں۔(۶)

---

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ انبالہ مسلم گریجوایٹ کالج، سرگودھا
**اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج، جھنگ

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

تہذیب ایک وسیع مظہر کے طور پر سامنے آتی ہے، اس کا دائرہ عمل کسی بھی گروہ کے زندگی گزارنے کے تصورات اور اس کے عقائد پر مشتمل ہے۔ عقائد میں کسی بھی گروہ یا قوم کی مذہبی اقدار اور افعال شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تہذیب انسانی معاشرت کے اعمال اور افکار سے بھی معاملہ کرتی ہے۔ کسی بھی خطے کے باشندے کس سوچ کے حامل ہیں؟ وہ اپنی خیالات و تصورات کی کون سی دنیا آباد کیے ہوئے ہیں؟ ان کا طرز معاشرت کن کن پہلوؤں کا حامل ہے؟ اور وہ ان تمام حالات وواقعات اور صورتوں میں کس نوع کا رویہ اختیار کرتے ہیں؟ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تہذیب اور ثقافت کو اکٹھا کر کے اسے کلچر کا نام دیا وہ لکھتے ہیں:

> میں نے لفظ تہذیب اور ثقافت کے معانی کو یکجا کر کے ان کے لیے لفظ کلچر کا استعمال کیا ہے، جس میں تہذیب و ثقافت دونوں کے مفاہیم شامل ہیں۔ اس کے معانی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے، جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کو خواہ وہ ذہنی ہوں یا جسمانی، خارجی ہوں یا داخلی احاطہ کر لیتا ہے۔(۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی تہذیب اور ثقافت کو علاحدہ علاحدہ مظاہر خیال کرنے کے قائل نہیں۔ وہ ان دونوں اصطلاحوں کے لیے 'کلچر' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ اصطلاح جامع ہے کیونکہ اس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے داخلی و خارجی خصائص جو بالآخر کسی خاص قوم، گروہ یا افراد کے خصائص ہیں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں ان کے افکار و خیالات اور نظریات سبھی شامل ہیں۔ اس کی خارجی صورت میں ان کا رہن سہن، کھانا پینا، پہناوا سبھی نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

> کلچر اس کُل کا نام ہے جس میں مذہب و عقائد، علوم اور اخلاقیات، معاملات اور معاشرت، فنون و ہنر، رسوم و رواج، افعال ارادی اور قانون، صرف اوقات اور وہ ساری عادتیں شامل ہیں جن کا انسان معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے اکتساب کرتا ہے۔(۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے میں 'کلچر' وہ واحد اصطلاح ہے جو جامعیت کی حامل ہے۔ اس میں کسی بھی قوم کا مذہب، عقائد، اور وہ جن علوم کو وقعت دیتی ہے شامل ہیں۔ کسی بھی قوم کے علوم اور ان کی حصول آوری اس قوم کے مذہبی عقائد کی روشنی و پیروی میں ہوتی ہے۔ معاشرہ اپنی اقدار اور رسوم رواج کی تقویت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے باسیوں کی عادات اور اطوار کا تعین بھی کرتا ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین کا 'کلچر' کے بارے میں کہنا ہے کہ وہ انسان کا طریق زیست ہوتا ہے، وہ اس کی فطرت کا اظہار کرتا ہے۔(۹) کلچر زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ وہ اقدار کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو ایک منظم طریقے سے معاملات زیست کے گزرن کا لائحہ عمل فراہم کرتا ہے۔ وہ یہ دکھاتا ہے کہ کسی بھی سماج کی مختلف پرتیں کس نوعیت کی تھیں اس کی اٹھان کن بنیادوں پر ہوئی اور وہ بنیادیں اسے کس فکری و نظریاتی مقام تک پہنچا سکتی ہیں۔ کیا وہ اقدار اعلیٰ اور ارفعی تھیں یہ ناقص و کم تر جو بالآخر اس کی تنزلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ کلچر کے ساتھ کسی بھی قسم کا اندرونی و بیرونی چھیڑ چھاڑ اس کی ہیت کو بدل دیتا ہے اس طرح اس کی کوئی مسخ شدہ صورت سامنے آتی ہے جو مزید انحطاط کا باعث بنتی ہے۔ بقول فیض احمد فیض:

> کلچر داخلی طور پر آپ کے طریق زندگی کا نام ہے۔ آپ کے ہر کام میں کلچر یا ثقافت کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر آپ اس سے چشم پوشی کریں گے تو اس سے کوئی نہ کوئی فتور واقع ہو گا جو آج کل ہماری قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں موجود ہے۔(۱۰)

فہیم اعظمی کے خیال میں بھی کلچر وسیع تر معانی کا حامل ہے جس میں عقائد، آرٹ، اخلاقیات، قانون، رسم و رواج، افراد کے عادات و خصائل سبھی شامل ہیں۔(۱۱)

ثقافت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ استعمار اور ثقافتی استعمار سے کیا مراد ہے؟ انگریزی لغت Longman میں استعماریت(Colonialism) کو کسی محکوم قوم یا رقبے پر اقتدار قرار دیا گیا ہے۔ تعریف کا دوسرا حصہ محکوم پر استبدادی حکمرانی کی حکمت عملی کی طرفداری کو استعماریت میں شامل کرتا ہے۔(۱۲) آکسفورڈ لغت میں استعماریت اس عمل کو قرار دیا گیا ہے جس کے تحت جب آباد کار کسی نئی زمین کو آباد کریں لیکن اپنی جدی ریاست سے تعلق برقرار رکھیں۔(۱۳) استعمار میں عسکری، معاشی یا افرادی قوت کے بل بوتے پر کوئی طاقتور ملک کسی کمزور ملک پر قبضہ جمالیتا ہے اور پھر اس کے وسائل اور باشندوں پر اپنا طرز حکمرانی تھوپ دیتا ہے۔ اس کا معاشی، سماجی، فکری، نظریاتی اور لسانی استحصال کرتا ہے۔ استعمار کی تاریخ بہت پرانی ہے، یونان نے مصر اور روم نے ترکی پر اپنا استعمار نافذ کیا۔ پندرہویں صدی میں انگلستان، فرانس، سپین، پرتگال اور دوسرے مغربی ممالک نے تجارت کا بہانہ بنا کر افریقہ، ہندوستان اور امریکہ پر استعمار جمایا۔ برصغیر پر برطانوی سامراج نے جہاں

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

مقامی باشندوں کے وسائل کو لوٹ کر خود کو ثروت مند کیا وہیں ان پر جسمانی طور پر ظلم کے پہاڑ توڑنے کے ساتھ ساتھ ان کو فکری سطح پر مفلوج کرنے کی کوشش کی۔ ان کی ثقافت کو مسخ کرنے کی شعوری کوشش کی گئی اس کوشش کا مقصد انہیں اپنے نصب العین سے دور کرنا تھا۔ اس ضمن میں احمد سہیل رقم طراز ہیں:

> نو آبادیاتی حکومتوں نے اپنی ہی نہیں بلکہ محکوم قوموں کی تاریخ بھی بگاڑ دی۔ جس میں تہذیبی استعماریت اور نو آبادیاتی قوموں کا احساس برتری حاوی ہے۔ ثقافتی مطالعوں میں ثقافتی افراقات سے ہی نسلی دبستان کی بنیاد پڑی جس میں اولین موضوعات نو آبادیات سے متعلقہ مباحث کے ہی ہوتے ہیں۔(۱۴)

استعماری قوتوں نے جہاں محکوم قوموں کے وسائل کو بے دردی سے استعمال کیا وہیں ان اقوام کی ثقافت کو بری طرح متاثر کیا۔ اپنے استعمار کو تقویت دینے کے لیے ان کو کم تر اور سست ثابت کیا۔ عوام کو اس بات کا احساس بہت شدت سے دلایا گیا کہ ان کی ثقافت باعث تفاخر نہیں بلکہ باعث شرمندگی ہے۔ انہیں اپنی بقا کے لیے استعماری ممالک کی ثقافت میں پناہ لینا ضروری ہے تاکہ وہ اپنا مستقبل محفوظ بنا سکیں۔ استعماریت نے عالمگیریت کے تاثر کو جنم دیا اور اپنی مخصوص صارفیت پر مبنی سوچ کے تحت دنیا میں ہر ثقافت کو دوسری کے ساتھ امتزاجی قرار دیا۔ ثقافتی استعماریت کی اسی صورت کے بارے میں ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

> بیسویں صدی کے اواخر میں پچھلی صدی کے سامراجی چکر نے خود کو کچھ حوالے سے دوبارہ پیدا کیا۔ حالانکہ اب کوئی وسیع و عریض خالی جگہیں، کوئی پھیلتی ہوئی سرحدیں، کوئی نئی آباد کاری نئی مہمات موجود نہیں، ہم ایک عالمی ماحول میں رہتے ہیں۔ جہاں بہت سے ماحولی، معاشی، سماجی اور سیاسی دباؤ اثر انداز ہوتے ہیں۔(۱۵)

ثقافتی استعمار کے حربے:

ثقافتی استعمار جسے (Cultural Colonialism) کا نام بھی دیا جاتا ہے، اپنی مختلف صورتوں میں استعماری ہتھکنڈے کے طور پر سرگرم عمل رہا ہے۔ استعمار نے کسی بھی معاشی، سماجی اور ثقافتی طور پر مفتوح قوم پر اپنے خونی پنجے جب بھی گاڑھے مادی فوائد اور ثروت مندی کے مہیب عزائم کے پہلو بہ پہلو اس قوم کو کمزور کرنے کا ایک ہتھکنڈا اسے ثقافتی طور پر کنگال قرار دینا تھا۔ پہلے پہل تو ایسا پرچار اور پراپیگنڈہ دبے لفظوں میں اور چھپ چھپا کر کیا جاتا تاکہ نامعلوم اور غیر محسوس طریقے سے کسی قوم کو ثقافتی کم مائیگی (Cultural inferioirty) اور ثقافتی تذلیل (Cultural disgrace) کا نشانہ بنایا جائے۔ اس قبح عمل کی بجا آوری کے لیے مقامی ایجنٹ کرایے پر لیے جاتے جو ایک منظم طریقہ کار کو اپناتے ہوئے مختلف مقامات پر، تقریبات اور عوامی اجتماعات میں اس ملک کی ثقافت کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے اور اسے ایک ختم ہو جانے والی، نامراد اور بنجر ثقافت ثابت کرتے۔ جیسے جیسے وقت بدلتا گیا استعمار نے اپنی شکلیں بدل لی ہیں۔ اب اس کی مختلف اور بھیانک صورتیں منظر عام پر آ رہی ہیں اور کہیں کہیں یہ ایک خاموش قاتل (Silent Killer)، خاموش دشمن (Silent Enemy) کی شکل میں برسرپیکار ہے۔ استعمار کی جدید صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ اب اسے اس حجت کی قطعا ضرورت باقی نہیں کہ وہ کسی ملک کی جغرافیائی حدود کی پامالی کرے۔ اس پر لشکر کشی کرے یا اس پر چڑھ دوڑے۔ اب ننگی جارحیت کا زمانہ گزر گیا۔ اب اس عمل کی بالکل بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اب استعمار کے حربے بدل چکے ہیں۔ اب میلوں دور بیٹھ کر بھی دوسرے ممالک پر اپنا تسط قائم کیا اور چلایا جا سکتا ہے۔ انہیں اپنے انتظامی اور معاشی ری موٹ کنٹرول پر چلایا، گھمایا اور پابند کیا جا سکتا ہے۔

اب معیشت، زبان، میڈیا کے ذریعے کسی بھی قوم کو فالج زدہ کیا جا سکتا ہے۔ ثقافتی استعمار کی جڑیں صارفیت زدہ معاشرے سے جڑی ہیں۔ اب کسی بھی ملک کے نظام پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کا اجارہ ہے وہ اپنے معاشی فوائد کے حصول کے لیے سماجی ذرائع ابلاغ سوشل میڈیا کا سہارا لیتے ہوئے منٹس اور سیکنڈز میں اپنا ایجنڈا دوسرے ممالک تک پہنچا رہی ہیں۔ ایک تشکیلی حقیقت (Hyper Reality) قائم کر دی گئی ہے۔ تعیشات اور سہولیات کو ضروریات کا جامہ پہنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک ملک کے طرز معاشرت، اخلاقیات، ملبوسات اور اشیا خورونوش کو دوسرے ممالک میں متعارف اور لاگو کروایا جا رہا ہے جن کا تعلق نہ ہی ان ممالک کے مذہب سے ہے، نہ معاشرت و معیشت سے اور نہ ہی اس کی آب و ہوا سے۔ لیکن چند مخصوص معاشی کرایہ دار ایجنٹوں کی مدد سے ان تمام مظاہر کو زبردستی اس قوم کی ثقافت کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔ فیفتھ جنریشن وار فیئر (Fifth Generation Warfare) کا سب سے کلیدی حربہ ہی یہی ہے کہ سب سے پہلے کسی قوم کو مخصوص چیزوں اور معاملات کے لیے ذہنی طور پر اتنا تیار کر دو کہ جب کوئی فکری، سماجی، ثقافتی جارحیت کی جائے تو اسے فوراً قبولیت حاصل ہو جائے اور اسے کسی معمولی مزاحمت کا بھی سامنا نہ کرنا پڑے۔ دور حاضر میں کسی بھی قوم کو اس کی زبان اور میڈیا کے ذریعے چوٹ لگائی جا رہی ہے۔ اب میڈیا پر اپیگنڈہ کی مدد سے مخصوص مٹھی بھر آلہ کاروں کے تعاون سے انقلاب برپا کیے جا رہے۔ کسی بھی معمولی نوعیت کے

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

معاملے کو اٹھا کر اگنیشن فراہم کر کے مزید بڑھاوا دیا جاتا اور بھڑکایا جاتا ہے۔ اپنی پسند اور مطلب کی حکومت لائی جا رہی ہے اور اس سارے انقلابی عمل کے ملبے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اس ملک کے باشندوں کے دل کی آواز اور خواہش دیرینہ تھی۔ اس معاملے میں بسا اوقات مقامی، عوامی جذبات(Local Sentiments) کو بھی اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل میں بروئے کار لایا جاتا ہے۔ حال ہی میں مشرق وسطی میں برپا کیے جانے والے سیاسی انقلابات اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

جدید سامراج دیگر ممالک کو معاشی اور فکری سطح پر اپاہج کر رہا ہے اس کا زور بار بار اس امر پر ہے کہ جو ہم آپ کو بتا رہے ہیں وہی سچ ہے اور آپ کو اس پر یقین کرنا ہو گا۔ بین الاقوامی میڈیا میں ایک سٹوری کو اس طرح تعمیر کیا جاتا ہے کہ اس میں کوئی شبہات باقی نہ رہیں اور لوگوں کو فکری طور پر ہپناٹائز کر کے اپنا کہا دوہرانے پر مجبور کر دیا جائے۔ اسی بنا پر بہت سے لوگ ایک فنڈڈ اور کنٹرولڈ میڈیا کی وجہ سے حقائق جاننے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ اس امر کی حقیقت تک نہیں پہنچ پاتے کہ تیونس اور مصر میں حکومتیں کیوں بدلیں؟ حسنی مبارک اتنے طویل اقتدار کے بعد کیسے اس قدر ناتواں کر دیا گیا؟ معمر قذافی کیوں اس درجہ کمزور کر دیا گیا ہے اسے سڑک پر لوگوں، گھسوں اور لاتوں سے مار دیا گیا۔ نہ ہی معلوم ہو پاتا ہے کہ شام میں فی الحقیقت کیا چل رہا ہے؟ کیا بشارالسد واقعی کمزور ہے یا کمزور دکھایا جا رہا ہے۔ داعش اور طالبان کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ بھی کسی بڑے سیاسی کھیل(Big Political Game) کا حصہ ہیں۔ شمالی کوریا، یمن اور ایران میں استعمار کی چالبازیاں کیا ہیں؟ فلسطین میں اسرائیل اور مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی جغرافیائی توسیع پسندانہ کاروائیاں اور عزائم کیا ہیں؟ ایک سموک سکرین(Smoke Screen) کا پیدا کرنا بھی جدید استعمار کا ایک ہتھکنڈا ہے۔ ہم اب بھی کہیں نہ کہیں اسی معلوماتی اندھیرے (Information Blackout) کے عہد میں رہ رہے ہیں۔ جس میں ہم اپنے آپ کو ایک مطلق العنان حکمران کے دور کا باشندہ ہی پاتے ہیں جو اپنے محل میں ہی بہ زور شمشیر تاریخ لکھوا رہا ہے۔ جدید سامراج بھی کچھ ایسا ہی کر رہا ہے۔ سچ اور حقیقت تک رسائی کٹھن بنا دی گئی ہے اور فیشن اور کھانوں کی ساحری میں پھنسا دیا گیا ہے اور یہ امر بھی بھرپور طور پر محسوس کروایا جا رہا ہے کہ اس طرز زندگی سے نکلو گے تو بقا مشکل ہو جائے گی۔ مارے جاؤ گے فنا ہو جاؤ گے ثقافتی و فکری قحط الرجال آ جائے گا۔ جدید اقوام عالم میں سر جھکائے اور پیچھے رہ جاؤ گے۔ انہیں اندیشوں کا شکار کروایا جا رہا ہے۔ اب چند سو فوجی کسی بھی سرزمین یا ملک میں بھیج کر اسے فتح کر لیا جاتا ہے۔ یہ عمل سہل اس بنا پر ہو گیا ہے کیونکہ اس ملک کے لوگ ذہنی طور پر پہلے ہی اس عمل کے لیے تیار ہو چکے ہوتے ہیں۔

کمزور اقوام کی تعلیمی پالیسوں، معیشت، ثقافت اور زبان پر جدید اور طاقتور استعمار نے قبضہ جما لیا ہے۔ اپنے مخصوص عزائم کے حصول کے لیے نصابات میں ایسے مواد کو شامل کروایا جا رہا ہے جو اگر فوراً نہ سہی تو چند سالوں بعد اپنے نتائج مرتب کرے اور تواتر کے ساتھ اس ملک کی مذہبی، ثقافتی اور فکری جڑوں کو کھوکھلا کرتا رہے۔ اسی طرح استعمار کے خلاف رد عمل اور آگاہی پیدا کرنے والا مواد کو ایک منظم طریقے سے خارج نصاب کروایا جا رہا ہے۔ کمزور اقوام کی معیشت کو بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جدید استعماری طاقتیں ان مالیاتی اداروں کو کنٹرول کرتی ہیں اور ان کے احکامات کے نتیجے میں ہی معاشی کمزوری اور بدحالی کے شکار ممالک کو قرضے فراہم کیے جاتے ہیں۔ قرضہ جات کی فراہمی کے ساتھ ہی مطالبات کی ایک فہرست بھی تھما دی جاتی ہے جو مزید ٹیکسز، اور معاشی بدحالی کی جانب دھکیل دیتی ہے۔ جدید استعمار اپنی صارفیت پسندانہ پالیسوں (Consumerised Policies) کا نفاذ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے کرتا ہے اس طرح یہ ایک باہمی گٹھ جوڑ کی ہی ایک شکل ہے۔ جس میں استعمار اور کمپنیاں تو پھلتی پھولتی ہیں لیکن معاشی طور پر کمزور ملک کمزور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جدید استعمار اپنی ثقافت کو میڈیا کے ذریعے ہر ملک تک پھیلا دیتا ہے۔ سیٹلائٹس پر اجارہ داری اور بڑی بڑی سافٹ وئیر کمپنیوں کی ملکیت کی بنا پر وہ یہ کام بہت سہولت سے کرتا ہے۔ اپنی زبان کو با آسانی ساری دنیا کے لیے لازمی اور ضروری بنا دیتا ہے کیونکہ وہ ہر طرح کا مواد اپنی زبان میں اپ لوڈ کرنے پر قادر ہے۔ یہ اس کے اختیار میں آ جاتا ہے کہ کس ملک، اور کس زبان کو اپنی سیٹلائیٹ کی دنیا میں کتنی جگہ دینی ہے۔ اس طرح ایک جدید سامراج اپنے ٹی وی چینلز کی مدد سے ایک خاص قسم کے مواد اور صداقتوں کی ترویج کا اجارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب وہ اس امر پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ اس تمام جدت کو معاشیات اور صارفیت زدگی سے منسلک کر دے۔ وہ ان استعماری حربوں کی مدد سے اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے۔

برصغیر میں استعمار کے انہی حربوں کو استعمال کیا گیا۔ استعماریت کا استحکام اور معاشرتی تقلیب کا عمل مختلف ثقافتی حکمت عملیوں کی مدد سے ممکن ہوا۔ اس تقلیب میں سب سے اہم حربہ تعلیم و تربیت کا تھا۔ تعلیم میں قدیم زبانوں (سنسکرت، عربی اور فارسی) جو ایک مضبوط روایت کی حامل تھیں کو بدلنا مشکل تھا ان کے مقابلے میں جدید دیسی زبانوں کو ترویج دی گئی کیونکہ ان میں ناپختگی کی بنا پر تبدیلیوں کی کافی گنجائش موجود تھی۔ جدید دیسی زبانوں کو استعماری حربے کے طور پر کچھ یوں بھی استعمال کیا گیا کہ ان کے ذریعے علاقائی سطحوں پر اختلافات کو ابھارا گیا۔ چارلز ٹریولین(Charles Trevelyan) نے اس بات کو واضح انداز میں بیان کیا کہ کس طرح تعلیم کے ذریعے استعماری تصورات کو دیسی زبانوں میں پھیلائے جانے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی۔ اس کے تحت مختلف مراحل میں غیر ملکی علم و حکمت سے واقفیت بہم پہنچانا۔ غیر ملکی علم و اب کے حصول کا میلان پیدا

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کرنا۔ تراجم، سائنسی اور علمی اصطلاحات کا شامل کرنا۔ اس کے نتیجے کے طور پر بہت سے اشاعتی ادارے قائم کیے گئے۔ جن میں کتب کی اشاعت کے ذریعے ادب کے مختلف رجحانات کی حوصلہ افزائی اور دیگر کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اشاعتی عمل پر کمپنی سرکار کی گہری نظر تھی۔ ۱۷۹۹ میں اخبارات پر چار نکاتی سنسر شپ عائد کر دی گئی۔ جس میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ بغیر سرکاری معائنے کے کوئی اخبار شائع نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۷۸۰ میں جاری ہونے والے ہکی بنگال گزٹ کو ایک برس کے اندر ہی کمپنی گورنر جنرل ہیسٹنگز کے خلاف مواد چھاپنے کی پاداش میں بند کر دیا گیا۔ ۱۸۲۳ میں قائم مقام گورنر جنرل جان ایڈم نے پریس آرڈیننس جاری کر دیا جس کے تحت لائسنس کے بغیر اخبار کا اجرا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کمپنی عہدے دار اس امر سے خوف زدہ تھے کہ پریس کی آزادی میں عوام کو کمپنی سرکار کے خلاف اکسایا جا سکتا ہے۔ اس خوف کے پیش نظر پریس کی آزادی پر مزید قدغنیں لگائی گئیں۔ جنگ آزادی میں معاونت کے شبے میں کئی اخبارات کو بندش کا سامنا کرنا پڑا اور مالکان کو سزائیں بھی دی گئیں۔ ۱۸۶۷ میں گورنر جنرل آف انڈیا ان کونسل ایکٹ کا نفاذ کیا گیا جس کی رو سے ہندوستان میں کوئی بھی کتابچہ، رسالہ وغیرہ چھاپنا قابل دست اندازی جرم قرار دے دیا گیا۔ خلاف ورزی پر دو سال قید یا پانچ ہزار جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکتی تھیں۔ اس سے باخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ استعماری حکومت کس طرح سچ کی آواز کو دبانے میں مصروف عمل تھی۔ اخبارات کو برطانوی سامراج کی ترویج اور حکومتی اقدامات کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ حکومت موافق اخبارات کو سہولیات فراہم کی جاتیں انہیں ٹیکس اور ڈاک خرچ میں چھوٹ دی جاتی۔ بعض اخبارت تو جنگ آزادی کے مجاہدین جنہیں باغیوں کے نام سے موسوم کیا گیا کی نشاندہی اور ان کی مخبری کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان باغیوں کی سزائیں بھی تجویز کرتے رہے۔

قدیم علم اور اصناف ادب کی حوصلہ شکنی اور جدید علم اور اصناف ادب کی حوصلہ افزائی بھی استعماری حربوں میں سے ایک ہے۔ نصابی کتب میں متعدد کا تعلق قصہ کہانی سے تھا۔ جان بوجھ کر نئے ذوق کی ترویج کی گئی۔ نصابی کتب کے لیے قصے، کہانیاں تحریر کروائے گئے۔ فورٹ ولیم کالج میں داستانوں اور قصے کہانیوں کی کتب کے تراجم کروائے گئے۔ دہلی کالج، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور سرکاری ملازمین کے گروہ نے اس نئے ذوق کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ سرکاری اور غیر سرکاری تعلیم نے میکالے کے اس تصور کو ایک حد تک سچ ثابت کر دکھایا جس کی تعلیمی پالیسی کے نتیجے میں ایسے افراد پیدا ہونا شروع ہو گئے جو ہندوستانی ہونے کے باوجود اپنے ذوق میں برطانوی تھے۔ اس نظام کت تحت مقامی تہذیب اور ادب کی مذمت اور مغربی تہذیب اور علم و ادب کی مدحت اور فوقیت کا تصور پروان چڑھا۔ سرکاری جامعات کے علاوہ مقامی ادارے بھی ہندوستانی عیوب کو کھول کھول کر بیان کر رہے تھے۔ اس ضمن میں قدیم معاشرت کی خرابیوں سے آگاہی، گزشتہ نسلوں کی رجعت پسندی، جہالت، بد دیانتی اور بزدلی پر لیکچر دیے جاتے۔ اس قسم کی تعلیم میں مغربی کلامیے کی پیروی کرتے ہوئے ہندوستانیوں کی آرام طلبی کو ان کی فطرت ثانیہ ثابت کیا جاتا۔ دیسی سماج کی ہولناک برائیوں سے پردہ اٹھایا جاتا اور ہندوستان کے دانشورانہ افلاس (Intellectual Poverty) کو واضح کیا جاتا۔ (۱۶)

جدید استعماری حربوں میں گلوبلائزیشن کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ارجن اپادرائے نے اس کی پانچ شکلوں کی نشاندہی کی ہے۔

اول: نسلی (Ethno Scapes): لوگوں کی غیر معمولی نقل و حرکت، سیاحوں اور تارکین وطن کی کثرت۔

دوم: معاشی (Finance Scapes): زر کی نقل و حرکت، سٹاک ایکسچینج، آزاد تجارت، آئی ایم ایف وغیرہ۔

سوم: نظریاتی (Ideo Scapes): مختلف و متعدد نظریات، اور سیاسی آئیڈیالوجیز کی نقل و حرکت۔

چہارم: ابلاغی (Media Scapes): اخبار، ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ کے ذریعے خبروں اور تصویروں کی نقل و حرکت۔ پنجم: ٹیکنالوجی (Techno Scapes): نت نئی ٹیکنالوجی کی نقل و حرکت (۱۷)

گلوبلائزیشن میں آزادانہ، متنوع اور بہ کثرت نقل و حرکت بنیادی عمل ہے۔ اس نقل و حرکت کو ممکن بنانے کے لیے تجارتی معاہدے (جیسے ڈبلیو ٹی او)، تجارتی ادارے (آئی ایم ایف، ورلڈ بنک) اور تجارتی بلاک (یورپی یونین، نیفٹا) قائم کیے گئے ہیں۔ ان سب کی پشت پر ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں جن کے ہاتھ میں دنیا کی سیاست اور تجارت ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے بقول:

> گلوبلائزیشن کی آزادانہ اور متنوع نقل و حرکت کے اثرات تین طرح کے ہیں: سیاسی، معاشی اور ثقافتی۔ دوسرے لفظوں میں گلوبلائزیشن کے ذریعے ملٹی نیشنل کمپنیاں سیاسی، معاشی اور ثقافتی غلبہ حاصل کرتی ہیں اور اس کے لیے

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

قانون شکنی سے لے کر قانون سازی ہر طرح کے اقدامات کو جائز سمجھتی ہیں۔ تاہم ان کمپنیوں نے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر "صارفیت کے کلچر" کو سب سے موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔(۱۸)

گلوبلائزیشن اولاً جسے ثقافتی یکسانیت کہتی ہے وہ آگے چل کر ثقافتی و لسانی اجارہ داری میں بدل جاتی ہے۔ ایک زبان اور ثقافت، دوسری زبانوں کو بے دخل اور مسخ کرنا شروع کر دیتی ہے، تاکہ اپنے غلبے کو ممکن بنا سکے۔ معاشی اور سیاسی اجارہ داری کا غلبہ جس قدر مضبوطی پکڑتا جاتا ہے استعمار اپنی پٹاری سے مزید مہلک ناگ نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کے نتائج گہری سفاکیت پر مبنی ہوتے ہیں۔

ثقافتی استعماریت کا متبادل بیانیہ:

ثقافتی اجارے کے اس ظالمانہ عہد میں کسی بھی سطح پر متبادل بیانیے کا منظر عام پر آنا از بس ضروری ہو جاتا ہے۔ جب تسلل کے ساتھ کسی خاص خطہ کے لیے معاندانہ فضا بنائی جا رہی ہو اور منفی تصور سازی کی جاری ہو تو اس قسم کے بیانیے کے متبادل ایک نئے اور مقامی بیانیے کو سامنے لانا لازمی ٹھہرتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے مطابق متبادل بیانیہ احتجاجی، مزاحمتی اور قومی بیانیوں ہی کے قبیل سے ہے، مگر کچھ باتوں میں ان سے مختلف ہوتا ہے۔ احتجاجی و مزاحمتی بیانیے استعمار کار کے بیانیوں پر منحصر ہوتے ہیں جب کہ متبادل بیانیہ استعمار کار کے حاوی بیانیوں پر لازمی انحصار سے آزاد ہوتا ہے۔ مزاحمتی بیانیہ اس مفہوم میں منحصر بیانیہ ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا، اس کی سمت اور حد استعمار کار کے بیانیوں سے طے ہوتی ہے۔ استعمار کار کے بیانیوں کی غیر موجودگی میں مزاحمتی بیانیے معدوم ہوتے ہیں۔ دوسری طرف متبادل بیانیے کا آغاز اپنے وجود کے مستند اظہار اور اپنی زبان، اپنی ثقافت کی بازیافت کی آرزو سے ہوتا ہے۔ وجود، زبان اور ثقافت استعماری بندوبست میں گمشدہ ہوتے ہیں۔ استعمار کار کے حاوی بیانیے اپنی خطابت، علمیات، گھن گرج اور ترسیل کے وسائل پر اجارے سے استعمار زدوں کے وجود، زبان اور ثقافت کو گمشدہ رکھتے ہیں۔ متبادل بیانیہ ان کی بازیافت کرتا ہے۔(۱۹)

ابتدائی اردو افسانے میں متبادل ثقافتی بیانیہ:

کسی بھی خطے کا ادب بھلے وہ شاعری ہو یا نثر اپنا ایک خاص مزاج رکھتا ہے۔ اردو فکشن میں استعمار کے اس سخت گیر بیانیے کا برصغیر کے مقامی لکھاریوں نے جواب دیا۔ اگر ہم اردو افسانے میں اس متبادل بیانیے کی بات کریں تو اس کا استعمال کسی اعلانیہ صورت میں نظر نہیں آتا لیکن اس کی بہت سی جھلکیاں ہمیں دکھائی دیتی ہیں۔ سامراج کے خاص جبر کے جواب میں مقامی ثقافت کے پرچار اور فروغ کا ایک خاموش مگر طاقت ور بیانیہ اردو افسانے میں دستیاب ہے۔ اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، علی عباس حسینی، سدرشن، بلونت سنگھ، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، اور سہیل عظیم آبادی کے افسانوں میں اس متبادل بیانیے کی صورتیں ملتی ہیں۔ یلدرم معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں ان کے افسانوں میں ہندوستانی معاشرت، اس کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار مناسب طور پر جگہ پاتی ہیں۔ یلدرم کے افسانوی مجموعے 'خیالستان' کے افسانے 'گلستان و خارستان' میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت ملتی ہے۔ افسانے میں رقص کا جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ ہندوستانی رقص اور موسیقی کی روایت کا آئینہ دار ہے۔ رقص کرتی پریوں کو خالص ہندوستانی لباس 'ساڑھی' میں ملبوس دکھایا گیا ہے پریاں گلابی، دھانی، ریشمی ساڑھیاں پہنے ہوئے ہوتی ہیں۔ ان کے ساز، رباب، بربط، ستار خالص ہندوستانی ساز ہیں ان کے نغمے غزل، قصیدہ، اور ٹھمریوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جو سب ہندوستانی ہیں۔ افسانے میں لطیفے، بوجھ، پہیلیاں، کہاوتیں سب ہندوستان کی ثقافت کو بیان کرتی ہیں۔ علی عباس حسینی کے افسانہ 'گونگاہری' میں سنگ تراشی کے فن کی تحسین کی گئی ہے جو ہندوستانی ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے۔ انہی کے ایک اور افسانہ 'پیا کی جوگن' میں فن موسیقی اور آلات موسیقی کو فخریہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ علی عباس حسینی کے ایک اور افسانہ 'کتے کا بھوگ' میں رقاصی کے فن کو بیان کیا گیا ہے۔

> ستاروں کی چمکتی ہوئی پیشواز زیب جسم، حسن خداداد پر بناؤ سنگار، ہونٹوں پر مسی کی دھڑی، آنکھوں میں سرمہ دنبالہ دار اٹھتی جوانی، رسیلی آواز، دلربا ادائیں، لچکتی کمر، ابھرتا جوبن، جب ذرا شوخی سے بھاؤ بتاتی مصاحبین 'ہائے وائے' کے نعرے بلند کرتے۔(۲۰)

اس طرح بین السطور ہندوستانی ثقافت پر فخر کا اظہار ملتا ہے۔ اس امر کو باور کروایا گیا ہے کہ اس دھرتی کی ثقافت ہی ہمیں عزیز تر ہے کیونکہ اس میں زرخیری کثرت سی پائی جاتی ہے۔ مختلف کرداروں کے ذریعے اس امر کا بیان ملتا ہے کہ ہندوستان میں موجود خاندانی کلچر پر سب کو فخر ہے کیونکہ اس میں مغربی سماج کی طرح خود غرضی اور مفاد پرستی شامل نہیں۔ مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بیویاں وفاداری اور عزت کی پیکر ہیں۔ یلدرم کے افسانہ 'حضرت دل کی سوانح عمری' میں ایسی ہندوستانی ماں کا ذکر ملتا ہے جو مذہب و ملت کی حدوں سے بلند ایک ایسا کردار ہے جو محبت، خلوص اور ایثار کا مجسمہ ہے۔ یلدرم کے اور افسانہ 'نکاح ثانی' میں ایک ایسی بیوی کا ذکر ملتا ہے جو اپنے شوہر کی وفادار

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہے گرچہ کہ اس کا شوہر کسی کسی عورت کی زلفوں کا اسیر ہو جاتا ہے لیکن ایک مشرقی اور ہندوستانی بیوی وفا شعاری کا پیکر ہوتی ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ وفا نبھاتی ہے۔ یلدرم کا افسانہ 'آئینے کے سامنے' بھی اسی موضوع پر ہے جس میں بیوی عزم، اور وفا شعاری کو پیکر ہے اس کا شوہر ایک میم کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ بیوی کو اس امر کا علم بھی ہوتا ہے لیکن وہ پھر بھی اپنے شوہر کی محبت کا دم بھرتی ہے اور اس کے ساتھ خلوص کا مظاہرہ کرتی ہے اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے۔ شوہر میم کی بری فطرت سے عاجز ہو کر آخر اپنی بیوی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اس افسانہ میں یلدرم نے واضح طور پر مغرب اور اس کی اقدار پر تنقید کی ہے اور اس تربیت کا بھی پردہ چاک کیا ہے جو مغربی عورتوں کو مطلبی اور خود غرض بنا رہی ہے۔ پریم چند کے افسانے 'ستی' میں کلو ایک بدصورت شخص ہے جبکہ اس کی بیوی ملیا بے حد خوب صورت ہے۔ کلو اپنی بدصورتی وجہ سے احساس کمتری کا شکار ہے اسے شبہ ہے کہ خوب صورت ملیا کہیں اسے چھوڑ کر نہ چلی جائے۔ دوسری طرف ملیا اپنے شوہر کی خدمت کر کے اسے یہ باور کروانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ اسے کلو سے محبت ہے۔ پریم چند ایک اور افسانہ 'شدھی' میں لالہ پریم ناتھ اپنی وفا شعار بیوی سے بے وفائی کا مرتکب ہوتا ہے اور بازار حسن میں بی حسنہ کی نذر اپنی تمام دولت کر بیٹھتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی وفا شعاری بیوی گومتی اسے معاف کر دیتی ہے اور گلے سے لگا لیتی ہے۔ سدرشن کے افسانہ 'تبدیل قسمت' میں سلطان سنگھ فقط اس مقصد کے تحت شادی کرتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کا بیمہ کروائے گا اور اسے ایک سال بعد قتل کر کے بیمہ کی رقم وصول کر کے امیر ہو جائے گا۔ لیکن اس کی بیوی سال کے عرصے میں اس کی اتنی خدمت کرتی ہے کہ اسے اپنا ارادہ ترک کرنا پڑتا ہے۔ نیاز فتح پوری کے افسانے 'فاطمہ' میں بھی ہندوستانی عورت کی وفا شعاری پر فخر کیا گیا ہے۔ فاطمہ اپنے والد کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ایک بوڑھے اور بدہیت شخص سے شادی کر لیتی ہے اور اس کے حسین و جمیل بھتیجے کی محبت کی پیش کش ٹھکرا دیتی ہے اور اس امر پر زور دیتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی محبت میں خیانت نہیں کر سکتی۔ نیاز کے افسانے 'خواب کے بعد بیداری' میں بھی ہندوستانی معاشرت کی اس خوبی کا اجاگر کیا گیا ہے کہ یہاں شوہر، مجازی خدا، پتی پرمیشور کا درجہ رکھتا ہے۔ افسانے میں نیاز نے مشرقی اور مغربی عورت کی محبت اور وفاداری کا تقابل بھی کیا ہے۔ افسانے کا کردار سعید جو ایک آزاد خیال نوجوان ہے اور مغربی تہذیب و ثقافت کا دلدادہ ہے وہ اپنی بیوی حمیدہ کو فراموش کر کے ایک انگریز عورت روزا کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن جیسے ہی وہ طاعون جیسے مہلک مرض کا شکار ہوتا ہے تو وہ فوراً اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ مصیبت کی اس گھڑی میں سعید کی وفا شعار بیوی حمیدہ ہی اس کا خیال رکھتی ہے۔ اس طرح نیاز نے انگریز کی خود غرضی اور بے وفائی کو اجاگر کیا ہے۔ نیاز کے ایک اور افسانے 'شہد آزادی' میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا تصادم پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کا ہیرو رشید مشرقی تہذیب کا پروردہ ہے جبکہ اس کی بیوی مغربی طرز معاشرت کو پسند کرتی ہے۔ رشید اپنی بیوی کو ایک ہندوستانی عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے جو اپنے گھر اور شوہر کا خیال رکھے اور اس کے عزیز رشتہ داروں کے ساتھ متوازن اور اچھا رویہ اختیار کرے۔ رشید کی بیوی رابعہ اسے مغربی معیار زندگی سے آشنا کروانا چاہتی ہے۔ رشید اپنی بیوی ربعہ سے ایک مکالمہ کرتا ہے جو ایک تقریر ی صورت میں ہے اس میں وہ مشرق اور مغرب کی تہذیب و ثقافت کا تقابل کرتا ہے۔ مشرقی سادگی، ایثار، محبت اور خلوص کا درس دیتا ہے جبکہ مغرب ہوس پرستی، خود غرضی اور دکھاوے پر قائم ہے۔ رشید کی بیوی اس کی باتوں سے قائل نہیں ہوتی وہ مغربی تہذیب کی پیرو رہتی ہے جس کا نتیجہ بالاخر اس کی خودکشی کی صورت میں واقع ہوتا ہے۔ وہ ایک آزاد خیال مرد سے تعلقات استوار کر لیتی ہے جو اسے دھوکہ دیتا ہے۔ نیاز فتح پوری نے اپنے افسانوں میں مغربی تہذیب پر مشرقی و ہندوستانی تہذیب کی برتری ثابت کی ہے۔

ہندوستانی ثقافت میں بہادری، شجاعت اور خودداری ایک قابل فخر خوبی رہی ہے۔ اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں کے ہاں ہندوستانی ثقافت کے ان رنگوں کو عمدگی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ پریم چند کا افسانہ 'رانی سارندھا' ہندوستانی عورت کی دلیری، سرفروشی، متانت، قوم پرستی کے جذبے کی علامت ہے۔ رانی سارندھا میدان جنگ میں مثالی شجاعت کے جوہر دکھاتی ہے۔ پریم چند کے ایک اور افسانہ 'ستی' بندیل کھنڈ کے ایک سورما کی بیٹی چنتا دیوی کے وطن پرستی اور سرفروشانہ جذبات سے معمور ہے۔ پریم چند کے افسانہ 'لال فیتہ' میں افسانے کا ہیرو ہری بلاس جو ایک منصف مزاج سرکاری عہدیدار ہے اسے حکومت 'رائے بہادر' کے خطاب سے سرفراز کرتی ہے لیکن وہ وطن پرستی کے جذبے کے تحت سامراج کا اعزاز وصول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ پریم چند ہی کے افسانہ 'قاتل' کا ہیرو دھرم ویر اور افسانہ 'جیل' کا ہیرو وشمبھر جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہیں۔ افسانہ 'قاتل کی ماں' میں عدم تشدد کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ رامیشوری کا بیٹا ونود ایک انگریز فوجی افسر کو قتل کر دیتا ہے اور اپنی جان بچانے کے لیے گھر میں آکر چھپ جاتا ہے لیکن اس کی ماں اس کے اس فعل پر اسے ملامت کرتی ہے وہ اسے امن اختیار کرنے کا درس دیتی ہے۔ اور اس پر زور دیتی ہے کہ اگر اس نے یہ فعل سرانجام دے بھی لیا ہے تو اب وہ مرد بنے اور قانون کا سامنا کرے۔ اس طرح دبک کر نہ بیٹھے۔ علی عباس حسینی کے افسانوں 'سماج کی بھینٹ'، 'شکار یا شکاری' 'خوش قسمت لڑکا' اور 'آم کا پھل' میں ہندوستان کے خوب صورت مناظر کی تعریف کر کے اظہار محبت کیا گیا ہے۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہندوستانی ثقافت میں مذہبی اور موسمی تہواروں، میلے ٹھیلوں کا ہمیشہ سے حصہ رہا ہے۔ اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں نے ان موضوعات پر افسانے تحریر کر کے اپنی ثقافت پر تفاخر کیا ہے۔ پریم چند کے افسانوں ’ عید گاہ‘، ’عجیب ہولی‘، ’بے غرض محسن‘ میں عید، ہولی، بیساکھی، ساون کے تہواروں اور میلے ٹھیلوں کے ذریعے امن، صلح جوئی، مساوات، بھائی چارے، ہم آہنگی اور انسان دوستی کے خصائص کو بیان کیا گیا ہے۔ سدرشن کے افسانہ ’سنیاسی ‘ میں لوہڑی کا بیان ملتا ہے کہ کس طرح لوہڑی کے دن صحن میں عورتوں کا جمگھٹا تھا وہ ہنستی اور گاتی اور آگ میں چاول پھنکتی تھیں۔ ہندوستانی ثقافت میں منائے جانے والے تہوار سماجی میل جول کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ان تہواروں میں زیادہ تر ایسے ہیں جنہیں مذہبی تہوار کا درجہ حاصل ہے لیکن سماجی میل جول اور تہذیبی جذب و انجذاب کے عمل نے ان تہواروں کو مذہبی حدبندیوں سے بلند کر کے سماجی تہوار کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ چنانچہ سماج کا ہر فرد چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہبی گروہ سے ہو یکساں جوش و خروش سے ان میں حصہ لیتا۔ سدرشن کے افسانہ ’سنیاسی‘ میں دسہرے کے انتظامات اور جشن کا ذکر ملتا ہے۔ بلونت سنگھ کے افسانہ ’گرنتھی‘ میں شنکرات کے تہوار کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح لوگ رنگ برنگے دوپٹے کیے ہوئے، ہارمونیم، ڈھولکی، چمٹا اور گانے بجاتے گردوارے جا رہے تھے۔

انسان دوستی، محبت، خلوص، فرض شناسی ہندوستانی معاشرت و ثقافت کا ایک وصف رہی ہے۔ اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں نے ثقافت کے ان پہلوؤں کا ذکر بھی خوبی سے کیا ہے۔ پریم چند کے افسانوں ’تالیف‘، ’زیور کا ڈبہ‘ اور ’زادراہ‘ میں انسان دوستی، خلوص، محبت، سخاوت، ایثار، فرض شناسی، دیانت داری اور رحم دلی کے جذبات کو بیان کیا گیا ہے۔ پریم چند کے افسانہ ’نمک کا داروغہ‘ میں دیانت داری اور فرض شناسی کی عمدہ مثال ملتی ہے۔ انگریز سامراج کے عہد میں جب نمک پر ٹیکس عائد کیا گیا تو منشی بنسی دھر جو نمک کے محکمہ میں داروغہ کے عہدہ پر فائز تھا وہ فرض شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پریم چند کے ایک اور افسانہ ’ہولی کی چھٹی‘ میں تعاون اور انسان دوستی کی مثال موجود ہے۔ پریم چند کے ایک اور افسانہ ’ڈگری کے روپئے‘ میں بھی دیانت داری اور فرض شناسی کی عمدہ مثال ملتی ہے۔ نعیم اور کیلاش گہرے دوست ہیں۔ نعیم ایک فرض شناس افسر اور کیلاش ایک ایمان دار صحافی ہے۔ ایک قتل کے واقعے میں کیلاش فرض پر دوستی کو قربان کر دیتا ہے نعیم کی بدعنوانیوں کا پردہ فاش کر دیتا ہے۔ علی عباس حسینی کے افسانہ ’دل کی آگ‘ میں ایک طوائف مشتری انسان دوستی کی بنیاد پر طاعون کے شکار بے یارو مددگار مولوی عبد الحق کی دل و جان سے خدمت کرتی ہے جو طوائفوں سے شدید نفرت کرتے تھے۔ علی عباس حسینی کے ایک اور افسانے ’دو شریفوں کا مقابلہ‘ میں انسانیت سے محبت کا درس ملتا ہے جس میں بہاری مذہب و ملت کی حدبندیوں سے بلند ہو کر مصیبت کے وقت ہر شخص کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ علی عباس حسینی کے افسانہ ’نئی ہمسائی‘ اور سدرشن کے افسانہ ’ترک نمود‘ میں انسان دوستی کی مثال ملتی ہے۔ ایثار اور قربانی کی ایک اور مثال سہیل عظیم آبادی کے افسانہ ’بھابی جان‘ میں بھی ملتی جس میں بھابی رقیہ جو اعلی حوصلگی، فراخ دلی اور ایثار کی عمدہ مثال ہے جو ہر کسی کی بے لوث ہو کر مدد کرتی ہے۔ ہندوستانی ثقافت میں انسان دوستی، محبت، خلوص، رواداری، اور دردمندی جیسے عناصر کے زیر اثر سماج میں ایسے رشتوں کا جنم ہوا جو ذات پات، ادنی و اعلی اور دوستی و دشمنی کی حدبندیوں سے بلند ہیں۔ یہ رشتے سماج میں ’چچا‘ ’ماموں‘ ’تایا‘ یا پھر دیگر ناموں سے معروف ہیں یہ تمام رشتے پورے سماج کو جوڑنے کا سبب ہیں۔ علی عباس حسینی کا افسانہ ’ شیخو چچا‘ میں شیخو چچا ایک ایسا ہی کردار ہے جو بلا تفریق، مذہب، مسلک، نسل، طبقے اور زبان کے سب کی مدد کرتا ہے۔ انسان دوستی کے ساتھ ساتھ ایک اور قدر جس کی بہت اہمیت ہے وہ مہمان نوازی کی قدر ہے مہمان کو ’ رحمت کا فرشتہ‘ او’ر بھگوان کا روپ‘ قرار دیا جاتا ہے۔ مہمان کو خیر و برکت کا باعث سمجھا جاتا ہے اور اس کی بہت تکریم کی جاتی ہے۔ اعظم کریوی کے افسانہ ’روپ سنگار‘ اور اوپندر ناتھ اشک کے افسانہ ’آکاش چاری‘ میں مہمان کی آمد پر بہت مسرت کا اظہار اور اس کی آؤ بھگت کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

ہندوستانی ثقافت میں سماج کی چھوٹی اکائی گھر ہے، ہندوستانی ثقافت انفرادی کے بجائے اجتماعی طرز زندگی پر اصرار کرتی ہے۔ مشترکہ خاندان کا تصور ہندوستان میں عام ہے اس کے تحت خاندان ایک ایسا سماجی ادارہ ہے جس میں بیک وقت تین، چار پیڑھیاں زندگی گزارتی ہیں۔ اس کے سبب ان میں مل جل کر رہنے اور ایک ساتھ بہت سے مسائل سے نبرد آزما ہونے اور ان پر قابو پانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کام آپس میں بانٹ لیے جاتے ہیں اور اس طرح گھر کے کسی ایک فرد پر سارے کاموں کا بوجھ نہیں پڑتا۔ گھر کے بزرگوں کے زیر سایہ بچوں اور نوجوانوں کی تربیت کا سامان ہو جاتا ہے۔ گھر کا محور عورتیں ہوتی ہیں جو گھر کو سجاتی سنوارتی ہیں اور سب کا احترام حاصل کرتی ہیں۔ پریم چند کے افسانہ ’مالکن‘ میں کچھ ایسی ہی صورت حال دیکھی جاسکتی ہے۔ رام پیاری گھر کا انتظام بھرپور طور پر چلاتی ہے۔ پریم چند کے افسانہ ’خانہ داماد‘ میں مشترکہ خاندان کی محبت اور خصائص کا بیان ملتا ہے۔ ہری دھن جب اپنے والد کی دوسری شادی کے بعد گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو جب وہ دنیا سے ٹھکرائے جانے کے بعد گھر دوبارہ واپس آتا ہے تو اسے اپنی سوتیلی ماں کی جانب سے بہت پیار ملتا ہے۔ مشترکہ خاندان ایک ایسی درسگاہ ثابت ہوتا ہے جہاں رشتوں کا پاس ہوتا ہے، باہمی ادب احترام، اخوت، محبت، صبر و قناعت، تحمل اور بردباری سکھائی جاتی ہے۔

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہندوستانی ثقافت میں مختلف تہواروں اور شادی بیاہ کی رسومات کی ادائیگی کے لیے سجنے سنوارنے اور خاص قسم کے لذیذ پکوان تیار کرنے رواج بھی ملتا ہے، اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں نے ان تمام ثقافتی عناصر کو خوبی سے بیان کیا ہے۔ پریم چند کے افسانہ ' طلوع محبت ' میں بناؤ سنگار اور زیبائش کا ذکر ملتا ہے اس طرح ہندوستانی ثقافت میں شادی بیاہ پر سجنے سنوارنے کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح چہرے پر ابٹن لگایا جاتا تھا، لال ساڑھی زیب تن کی جاتی اور پھولوں کے ہار گلوں میں ڈالے جاتے۔ افسانوں 'کفن' اور 'بوڑھی کا کی' میں شادی بیاہ کی رسومات اور مختلف کھانوں کا ذکر بہت عمدگی سے ملتا ہے۔ افسانہ 'بوڑھی کا کی' میں اس جھلک کچھ یوں ملتی ہے:

> بدھ رام کے دروازے پر شہنائی بج رہی تھی اور گاؤں کے بچوں کا جم غفیر نگاہ حیرت سے گانے کی داد دے رہا تھا۔ چارپائیوں پر مہمان لیٹے ہوئے نائیوں سے ٹکیاں لگوا رہے تھے۔ قریب ہی ایک بھاٹ کھڑا کبت سنا رہا تھا۔ آج بدھ رام کے بڑے لڑکے سکھ رام کا تلک آیا ہے یہ اسی کا جشن ہے۔ گھر میں مستورات گا رہی تھیں اور روپا مہمانوں کی دعوت کا سامان کرنے میں مصروف تھی۔ بھٹیوں پر کڑاہ چڑھے ہوئے تھے۔ ایک میں پوریاں اور کچوریاں نکل رہی تھیں۔ دوسرے میں سموسے اور پیڑا کیں بنتی تھیں۔ ایک بڑے ہنڈے میں مصالحے دار ترکاری پک رہی تھی۔ گھی اور مصالحے کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔(۲۱)

علی عباس حسینی کے افسانہ 'باسی پھول' میں شادی بیاہ کی رسموں اور ان میں پھولوں کے لازمی استعمال اور زیبائش کا ذکر ملتا ہے، کہ کیسے چلمن، کمروں اور دیواروں پر پھول پڑے تھے۔ کس طرح عورتوں نے بالوں، گلے اور کلائیوں میں پھول سجا رکھے تھے۔ علی عباس حسینی کے افسانہ 'آئی۔ سی۔ ایس' میں شادی کے بعد دولہن کی رونمائی کی رسم کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح گھر کے بڑے بوڑھے کوئی تحفہ دے کر دولہن کا استقبال اور رونمائی کرتے تھے۔

ہندوستانی ثقافت میں پنچائیت کی بہت اہمیت ہے۔ کسی بھی گاؤں یا آبادی کے چند بڑے، معززین اور تجربہ کار لوگ پنچائیت قائم کر لیتے ہیں اور وہاں علاقے کے روز مرہ معاملات، لڑائی جھگڑوں کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے اس طرح علاقہ مکینوں کو فوری اور اچھا انصاف میسر آجاتا ہے۔ اتفاق رائے سے مسائل کا حل نکل آتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے افسانہ 'الاؤ' میں اسی پنچائیت کی اہمیت کی تعریف کی گئی ہے۔ سدرشن کے افسانہ 'دو دوست' میں سرداری لال کی بہن اپنے حق کے لیے اپنے بھائی کے خلاف پنچائیت بلاتی ہے۔ پنچائیت کے لیے پنچ کے روپ میں سرداری لال کے بچپن کے دوست بنواری لال کو چنا جاتا ہے۔ بنواری لال اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے اور سرداری لال سے کہتا ہے کہ فیصلہ اصول اور قانون کے مطابق کرے گا۔ ہندوستانی ثقافت میں چوپالوں کی خاص اہمیت رہی ہے۔ چوپالوں پر بیٹھ کر روز مرہ کے کئی معاملات پر بحث کی جاتی ہے جس سے لوگوں کو ایک اچھی تفریح فراہم ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے مسائل کا ادراک ہوتا ہے۔ علی عباس حسینی کے افسانہ 'امتحان قدرت' میں چوپالوں اور عوامی مراکز کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔

اردو افسانے کے ابتدائی افسانہ نگاروں کے ہاں استعماری بیانیے کے جواب میں ایک متبادل مزاحمتی و معدافعتی بیانیے کا اظہار ملتا ہے۔ اس متبادل بیانیے میں ہندوستانی ثقافت کے گوناگوں مظاہر کو ایک خاص تخلیقی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ اپنی روح کے اعتبار سے ایک پروقار اور متین بیانیہ ہے جس میں کہیں تو بلاالوسطہ ہندوستانی ثقافت پر احساس تفاخر سے کام لیا گیا ہے، مغربی ثقافت پر براہ راست تنقید ملتی ہے اور اسے ایک کھوکھلی اور بیمار ثقافت قرار دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں بین السطور اور زیریں لہر کے طور پر یہ بیانیہ چلتا ہے۔ مذہبی اقدار، مشرقی روایات اور ہند تہذیب کو فخر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ افسانوں میں مقامی کردار اور مقامی زبان ملتی ہے اسلوب میں خالص ہندوستانی رنگ غالب ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اردو لغت تاریخی اصول پر، اردو لغت بورڈ، کراچی، جلد ششم، ص ۳۲۰

۲۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، (کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۴)، ص ۴۷

۳۔ ایضاً، ص ۴۷

۴۔ ایضاً، ص ۴۷

۵۔ ایضاً، ص ۴۷

۶۔ انتظار حسین، قومی تشخص اور ثقافت، مشمولہ: کلچر (منتخب تنقیدی مضامین)، اشتیاق احمد (مرتبہ)، (لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۷)، ص ۳۴۹

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۴۲
۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، کلچر کیا ہے؟، مشمولہ: کلچر (منتخب تنقیدی مضامین)، اشتیاق احمد (مرتبہ)، (لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۷)، ص ۸۱
۹۔ ممتاز حسین، ادب اور شعور، (کراچی: ادارہ نقد ادب، ۱۹۹۲)، ۱۸۸
۱۰۔ فیض احمد فیض، پاکستانی ثقافت اور اس کے مسائل، مشمولہ: پاکستانی ثقافت، ڈاکٹر رشید امجد (مرتبہ)، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۹)، ص ۱۹۲
۱۱۔ فہیم اعظمی، آرا ۲۱ (کراچی: مکتبہ صریر، ۱۹۹۷)، ص ۲۸۲
۱۲۔ Longman Dictionary of English Language(Essex:Longman,1984),P283
۱۳۔ Oxford English Dictionary, Quoted in Colonialism|Post Colonialism,Ania Loomba(London:Routledge 1998),P 7
۱۴۔ احمد سہیل، سامراج نئی نو آبادیات اور رد نو آبادیات www.urduchanal in \samraj
۱۵۔ ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج، مترجم: یاسر جواد، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹)، ص ۳۰
۱۶۔ محمد نعیم، اردو ناول اور استعماریت، (لاہور: کتاب محل، ۲۰۱۷)، ص ۵۸۔۵۷
۱۷۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، (اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع دوم ۲۰۱۴)، ص ۴۴۔۴۳
۱۸۔ ایضاً، ص ۴۴
۱۹۔ ناصر عباس نیر، اردو کی تشکیل جدید، (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۶)، پیش لفظ
۲۰۔ علی عباس حسینی، باسی پھول، (لاہور: مکتبہ اردو پاکستان، ۱۹۴۷)، ندارد
۲۱۔ طاہر منور فاروقی (مرتبہ)، پریم چند کے بے مثال افسانے (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸)، ص ۱۲۸۔۱۲۷